ترکی میں اسلام اور سیکولرازم کی کشمکش

(حالیہ انقلاب سے پہلے تک)

جناب خلیل احمد حامدی

ترکی کی اسلامی تحریک کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے خود ترکی کے بارے میں چند بنیادی حقائق جان لینا مفید رہے گا۔

تاریخی پس منظر ترکی کا موجودہ رقبہ ۷ لاکھ ۸۰ ہزار ۵ سو ۷۶ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۴۳ ملین یعنی ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ افراد۔ اس میں ۹۸٫۹ فیصد مسلمان ہیں اور ۱٫۱ فیصد دیگر اقلیتیں مثلاً یہودی، آرتھوڈکس، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ کے پیروکار۔

ترکی کے موجودہ علاقے کو ماضی میں ایشیائے کوچک کہا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس کے کچھ حصے مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے ملاذکرد میں بازنطینی حکمران کو شکست دے کر اس علاقے میں مسلمانوں کی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی مکمل سلطنت اس علاقے میں ۱۲۸۸ء میں قائم ہوئی جس کا بانی عثمان بن ارطغرل تھا۔ اس لیے تاریخ میں اُسے سلطنت عثمانیہ کہا جاتا ہے۔ عثمانی حکمرانوں کی شجاعت اور دینی حمیت کی بدولت یہ سلطنت مسلسل ترقی پذیر رہی۔ ۱۵۲۰ء سے لے کر ۱۵۶۶ء تک کا زمانہ اس سلطنت کا دورِ عروج کہلاتا ہے۔ یہ سلطان سلیمان قانونی کا دورِ حکومت تھا۔ اس دور میں سلطنتِ عثمانیہ رُوس کے جنوب، ایشیائے کوچک، عراق اور خلیجِ عربی سے لے کر شمالی افریقہ میں مراکش کی حدود تک پھیل گئی عثمانیوں نے دو مرتبہ (۱۵۲۹ء اور ۱۶۸۳ء میں) یورپ کے اندر ویانا کے راستے پیش قدمی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آتے رہے۔ اگر عثمانی سلاطین یورپ میں

داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو اب دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

ایک طرف یورپ کی صلیبی طاقتوں کے سامنے سلطنتِ عثمانیہ برسرِ پیکار رہی۔ اور دوسری طرف ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں پوری دو صدیوں میں روس کے ساتھ ترکی کی طویل جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ دونوں طاقتیں سلطنتِ عثمانیہ کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی رہیں۔ آخر کار یہ سلطنت ۱۹ ویں صدی کے وسط سے کمزور ہونا شروع ہوئی۔ بیرونی دشمنوں کی سازشوں اور چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ اب اندرونی طور پر بھی ایسے اسباب مہیا ہو گئے جنہوں نے سلطنت کی جڑیں ہلا دیں۔ اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں بیرونی اور اندرونی دونوں طرف کے دشمنانِ اسلام کو مصطفےٰ کمال پاشا کی شکل میں ایک ایسا شخص مل گیا، جس نے ان کی آرزوؤں کو پورا کر دیا۔ کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں عثمانی سلطنت کو ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد ترکی نہایت تاریک دور میں داخل ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کی وفات تک پورے ۱۴ سال ترکی لادین آمریت کے شکنجے میں گرفتار رہا۔ کمال اتاترک کے مرنے کے بعد عصمت انونو حکمرانی کی مسند پر بیٹھا اور ۱۹۵۰ء تک اس نے فوجی جرنیلوں کی مدد سے حکومت کی اور اس پالیسی کو پوری طاقت کے ساتھ برقرار رکھا جو اس کے پیش رو نے تجویز کی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں عصمت انونو کے ہاتھ سے اقتدار نکل گیا۔ اور پھر اسی وقت سے ترکی میں واحد حکمران پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹیاں بھی وجود میں آگئیں۔ اور ترکی کی سیاست میں ایک نئی تبدیلی کا آغاز ہو گیا۔

مصطفےٰ کمال پاشا کی "اصلاحات" مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں نے ترکی کے اندر اسلامی خلافت کو ختم کرنے کے بعد جو کچھ وہاں کیا وہ ایک طویل بحث ہے۔ اس کا خلاصہ میں استنبول کے ہائر اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں فقہ کے پروفیسر خیرالدین قرہ مان کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

"ترکی قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ دیا گیا۔ اسے مادہ پرست، قوم پرست اور مغربی تہذیب کی دلدادہ قوم بنانے کی کوشش کی گئی۔ ترکی کو ایک لادین ریاست میں بدل دیا گیا۔ مذہب اور سیاست کو جدا جدا کر دیا گیا۔ مذہب کو انسان کا ذاتی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اور ہر فرد کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ خلافت کا ادارہ منسوخ کر دیا گیا، شرعی قوانین اور اسلامی عدالتیں ختم کر دی گئیں۔

شرعی قوانین کے بجائے یورپی قوانین درآمد کیے گئے۔ سوئٹزرلینڈ سے دیوانی قانون، اٹلی سے فوجداری قوانین اور جرمنی سے تجارتی قانون درآمد کیا گیا۔ احوالِ شخصیہ یعنی نکاح و طلاق اور وراثت و وصیت کے معاملات یورپ کے دیوانی قانون کے تابع کر دیے گئے۔ دینی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی اور دینی تعلیم کے ادارے مقفل کر دیے گئے۔ عورت کے لیے پردہ ممنوع اور بے پردگی لازم قرار دی گئی۔ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کا نظام جاری کیا گیا۔ عربی رسم الخط منسوخ کرکے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ عربی زبان میں اذان روک دی گئی۔ لباس بدل دیا گیا۔ پتلون اور ہیٹ کا استعمال لازم ٹھہرا لیا گیا"۔

(بحوالہ ہفت روزہ الدعوۃ۔ ریاض شمارہ ۲ فروری ۱۹۸۱ء)

نوری تحریک اس دورِ ظلمت میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی خدا کے بندے اُٹھے اور جان کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ ان میں نمایاں تر شخصیت علامہ بدیع الزمان سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ موصوف ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں فوت ہوئے۔ گویا انہوں نے ترکی کا پورا دورِ زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خلافت اُن کے سامنے ختم ہوئی۔ علمائے حق ان کی آنکھوں کے سامنے جام شہادت نوش کرتے رہے یا تعذیب کی بھٹی میں جھونکے جاتے رہے۔ لادینیت کا دیوِ استبداد اُن کے سامنے پاکوبی کرتا رہا۔ اس دورِ پُرآشوب میں انہوں نے اسلام کی دعوت کا فریضہ سنبھالا۔ انہوں نے مغربی تہذیب کی فکری یلغار کے سامنے اسلام کے بنیادی عقائد کی اشاعت پر زور دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مضامین قلمبند کرتے اور پھر اپنے شاگردوں کے ذریعے ان کی دستی کاپیاں تیار کرواکر عام لوگوں کے اندر خفیہ طور سے پھیلاتے۔ یہ سلسلہ انہوں نے اس منظم اور خاموش طریقے سے جاری کیا کہ پیشتر اس کے کہ ترکی کے لادین حکمرانوں کو اس کی خبر ہو، اُن کی دعوت ہزاروں نوجوانوں تک پہنچ گئی۔ ان مضامین کو "رسائلِ نور" کا عنوان دیا گیا۔ ان کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ اور یہ دست بدست ملک کے اندر پھیل رہے تھے۔

جب حکومت کو ان رسائل کا علم ہوا تو وہ بڑی جزبز ہوئی۔ چنانچہ علامہ بدیع الزمان نورسی اور اُن کے شاگردوں کے خلاف حکومت حرکت میں آگئی۔ اور شدت کے ساتھ اُن کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ علامہ مرحوم کی زیادہ تر زندگی جیل کی سلاخوں کے اندر گذری۔ بارہا اُن پر مقدمات

قائم کیے اور اُن پر الزام صرف یہ تھا کہ وہ ایک لادین ریاست کے اندر اسلام کا پرچار کرتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں مُلک میں امن عامہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک مرتبہ مرحوم نے ترکی عدالت کے سامنے اپنا دفاع کرتے ہوئے فرمایا:

"کوئی بھی تحریک خواہ وہ کتنی ہی پھیل جائے حکومت کے سقوط تک نہیں پہنچ سکتی۔ ماچس کی ایک تیلی سے اگرچہ ایک عمارت نذرِ آتش کی جا سکتی ہے۔ لیکن کیا یہ معقول بات ہوگی کہ جس کے پاس بھی وہ تیلی ہو، وہ مجرم ہے خواہ وہ عمارت کو جلانے کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ۔ وکیل استغاثہ نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ رسائل نور اس حد تک پھیل چکے ہیں کہ کم از کم اناضول کے اندر ۶ لاکھ انسان انہیں پڑھ چکے ہیں۔ ان میں سے اساتذہ بھی ہیں اور کسان بھی۔ طلباء بھی ہیں اور سرکاری ملازمین بھی۔ تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ان رسائل کے مطالعہ کے بعد کسی شخص نے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی کی ہے؟ یا اس کی قومی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے؟ یا اُن میں سے کسی شخص کے ہاتھوں امنِ عامہ کو خطرہ لاحق ہوا ہے؟ یا اس نے ملکی دستور کی خلاف ورزی کی ہے؟ لہٰذا تم اس تعلیمی مشن کو بند کرنے کے لیے کیا جواز رکھتے ہو، جس کی جڑیں لاکھوں ترک شہریوں کے دل میں اُتر چکی ہیں؟"

"تمہارا یہ اعتراض بھی ہے کہ ہماری یہ سرگرمیاں حکومت کی اجازت کے بغیر جاری ہیں۔ یعنی ہمارا فرض تھا کہ ہم حکومت کے محکمہ اُمورِ مذہبی سے لائسنس لے کر یہ کام کرتے۔ یعنی ہم اللہ کی عبادت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے لیے حکومت سے لائسنس لیتے؟ مجھ پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ سرکاری احکام کے باوجود میں نے دیسی ٹوپی ترک کر کے ہیٹ نہیں پہنا۔ اور اسی حالت میں عدالت میں آ گیا ہوں، اس سے عدالت کی توہین ہوتی ہے۔ لیکن آپ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ملک کے اندر ان لوگوں کی تعداد انتہائی کم ہے جنہوں نے خوشدلی کے ساتھ عمامہ چھوڑ کر یورپی ہیٹ اوڑھا ہے آپ لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ تو یہ ناروا سلوک ہے اور دوسری طرف فری میسن اور دوسرے اُن کے ہم مشرب لوگوں کو اس امر کی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ وہ اسلام کا

جس قدر شرمناک طریقے سے تمسخر اُڑانا چاہیں اُڑا لیں۔ اور جس حد تک چاہیں لوگوں کے اندر شراب، زنا اور جوئے کو رواج دیں لیکن مجھے اتنی بھی اجازت نہ ہو کہ میں لوگوں کو قرآن سناؤں اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دوں"۔

مرحوم کو عمر کے آخری حصے میں ایک بار پھر گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ بھی ان پر الزام یہ عاید کیا گیا تھا کہ وہ امن شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اقتدار کے بھوکے ہیں۔ مرحوم نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"اے حکمرانو، تم سمجھتے ہو کہ میں کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ تمام جد و جہد کر رہا ہوں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ دیکھو اسّی سال کا بوڑھا انسان، جس کی ٹانگیں قبر میں ہیں۔ بے وسیلہ انسان جس کے پاس دنیا کی کوئی متاع نہیں ہے۔ نہ مکان اور نہ زمین۔ اس عمر میں میں کسی دنیاوی مفاد کو حاصل کر کے کیا کروں گا۔ میں نے اپنی زندگی میدانِ جہاد میں گزاری ہے۔ جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں مجھے برسوں تک محبوس رکھا گیا، کبھی جیل میں اور کبھی جلاوطنی میں بے بس و بے سہارا پڑا رہا۔ بستی بستی اور شہر شہر میرا تعاقب کیا گیا۔ معاشرے کے اندر تم لوگوں نے مجھے اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ تم لوگوں نے مجھے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنے سے بھی محروم رکھا۔ اگر میرے اندر ایمان و احتساب کی طاقت نہ ہوتی جو ہمیشہ مجھے مایوسی کی تاریکیوں سے نکالتی رہی ہے تو میں اس مکدر زندگی پر موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن ان آلام و مصائب سے پُر زندگی کے باوجود میں نے یہ رسائل تحریر کیے ہیں اور الحمدللہ ان رسائل سے ۵ لاکھ سے زیادہ انسانوں نے استفادہ کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنی قوم کی خاطر یہ قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائی"۔

جماعتِ نور اور دوسرے چند اسلامی گروپ سیاست سے کنارہ کش ہو کر جوانوں کی فکری اور اخلاقی تربیت میں لگے رہے۔ سیاست سے ان کی کنارہ کشی اسلام کے جامع تصور سے ناواقفیت کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ ان کا سامنا ایک نہایت بے رحم اور ظالم و جابر حکومت سے تھا، جس نے ملک کے اندر الحاد اور بے دینی کو فروغ دینے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار

کر رکھے تھے۔ اور ترک نوجوان ان سے متاثر اور مرعوب ہو رہے تھے، اسی لیے بدیع الزمان نورسی مرحوم اور ان کے شاگرد تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور رہوئے۔ خود بدیع الزماں نورسی مرحوم کا ابتدائی دور سیاسی سرگرمیوں سے بھرپور نظر آتا ہے۔ وہ اقتدار کے خلاف بڑی جرأت کے ساتھ برسرپیکار رہے ہیں اور بڑے بڑے سیاسی معرکے انہوں نے سرانجام دیے ہیں۔ کئی مرتبہ انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔ بلکہ اُن کے بیسیوں ساتھیوں کو بالفعل تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وہ عزیمت کا پہاڑ تھے۔ لیکن آخر کار انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ حالات کے پیش نظر اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ نوجوانوں کے اندر ایمان و عقیدے کی پختگی کے ساتھ اُن کی اخلاقی تربیت کی جائے تاکہ جب حالات میں کچھ تبدیلی ہو تو پھر یہی نوجوان اسلام کے کامل احیاء کا علم تھام لیں۔ علامہ بدیع الزمان نورسی کی دور اندیشی کام آگئی۔ ترکی کی موجودہ اسلامی تحریک اسی نرسری فارم سے تیار ہوئی ہے جس کی تخم ریزی اور آبیاری مرحوم کر گئے ہیں۔

جمہوری زندگی کا آغاز

یہ تھا ترکی کی اسلامی تحریک کا ایک دور۔ دوسرا دور ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن ہم اپنی بات کو ۱۹۵۰ء سے شروع کرنے کے بجائے اس دور کے عالمی حالات پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان عالمی حالات نے ہی درحقیقت ترکی کی اسلامی تحریک کو ایک نئے دور میں داخل کیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سٹالن نے ترکی کے سامنے چند نئے مطالبات رکھے۔ مثلاً روس کو آبنائے باسفورس استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ ترکی کے بعض صوبوں پر بھی سٹالن نے دعویٰ کر دیا۔ ترکی کی کمزور حکومت ان روسی مطالبات سے پریشان ہو گئی۔ اور اُسے امریکی سیاست کے سامنے جھک کر اپنے بچاؤ کے لیے معاہدۂ اطلانتک میں شامل ہونا پڑا۔ لیکن معاہدہ اطلانتک کے رکن ممالک نے اس وقت تک ترکی کی رکنیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک ترکی کے اندر جمہوری نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ یعنی یک جماعتی آمرانہ نظام کے بجائے ایک سے زیادہ جماعتوں کا نظام۔

یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ معاہدہ اطلانتک کے رکن ممالک کا مقصد یہ تھا کہ انہیں یہ اطمینان ہو جائے کہ ترکی کا سیکولر نظام فی الواقع عوام کے جذبات کا آئینہ ہے۔ بلکہ اُن کا خیال تھا کہ وہ ترکی

میں مغربی طرز کے جمہوری نظام کی بدولت ترکی کو مکمل طور پہ سیکولر بنا دیں گے، اور ترکی صحیح معنوں میں یورپ کا ایک حصہ بن جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس شر میں سے ترک مسلمانوں کے لیے خیر کا پہلو برآمد کر دیا۔

ترکی نے یہ مطالبہ مان لیا کہ وہ وہاں ایک مغربی نظام کے بجائے تعدّدِ احزاب کا نظام جاری ہو۔ ترکی کی حکمران جماعت ریپبلکن پارٹی کے صدر عصمت انونو صاحب کو یہ نیا نظام قبول کر لینے پہ اس لیے کوئی تشویش نہ ہوئی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی میں لادینیت کی جڑیں خاصی مضبوط ہو چکی ہیں۔ اسلام کے بارے میں نفرت لوگوں کے دلوں میں رچ بس چکی ہے۔ اور مغربی طرزِ زندگی پہ لوگ اس قدر فریفتہ ہو چکے ہیں کہ اب ان کے لیے اسلام کی طرف واپس آنا ناممکن ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی میں جو اپوزیشن پارٹی بھی وجود میں آئے گی وہ ریپبلکن پارٹی کے بطن سے جنم لے گی اور یوں وہ ان تمام اوصاف کی حامل ہوگی جو خود ریپبلکن پارٹی کے اندر پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ عصمت انونو نے کمال اتاترک ہی کے دور کے ایک وزیر بایار کو یہ مہم سپرد کی کہ وہ حزبِ مخالف تشکیل کریں۔ چنانچہ حکمران پارٹی ریپبلکن کے مقابلے میں جلال بایار نے ڈیموکریٹک پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی میں جلال بایار کے بعد دوسری شخصیت عدنان مندریس کی تھی۔

اسلامی اصلاحات عدنان مندریس کے عہد میں

عدنان مندریس کا تعلق ترکی کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے والد عالمِ دین تھے۔ خود عدنان مندریس عوام الناس کی نفسیات اور ان کے احساسات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ وہ انہیں خطاب کرنا جانتے تھے۔ والد کی روح بھی ان کے اندر سرایت کیے ہوتے تھی۔ آگے چل کر وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے ایک دھماکہ خیز شخصیت ثابت ہوئے۔

نئے نظام کے تحت ۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ ترکی میں انتخابات ہوئے۔ ڈیموکریٹک پارٹی ایک حیرت انگیز منشور لے کر انتخابات میں اتر گئی۔ امریکی مبصرین کے مطابق بظاہر حالات میں اس منشور کی ناکامی یقینی امر تھا۔ وہ منشور یہ تھا:-

۱۔ ترکی کے اندر عربی زبان میں اذان بحال کر دی جائے گی۔

۲۔ ترکوں کو حج بیت اللہ کی اجازت دے دی جائے گی۔

۳۔ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس پر پابندی ختم کر دی جائے گی۔
۴۔ ریاست عورت کے لباس کے معاملے میں کوئی دخل نہ دے گی۔
۵۔ ایا صوفیا کی مسجد واگزار کر دی جائے گی۔ (یہ مسجد پانچ سو سال سے چلی آرہی تھی، جسے کمال پاشا نے میوزم میں بدل دیا تھا)۔

ایک ترک دانشور نے اس منشور پر اور دو پارٹیوں کو انتخابات میں شریک ہونے کی اجازت دیے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے؟

"امریکی لیڈر دراصل یہ امتحان لینا چاہتے تھے کہ کمال ازم ترکی کے اسلامی جذبات کی بیخ کنی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے لیکن اس امتحان کا نتیجہ ان کے لیے انتہائی حیران کن نکلا۔ کمال پاشا کی ری پبلکن پارٹی پہلے ہی مرحلے میں گر گئی۔ اسے پارلیمنٹ میں صرف ۳۲ نشستیں ملیں جب کہ ڈیموکریٹک پارٹی نے ۳۱۸ نشستیں جیت لیں"۔

عدنان مندریس کو کامیاب ہونے کے بعد اپنے وہ وعدے پورے کرنے پڑے جو اس نے انتخابی مہم کے دوران عوام سے کیے تھے۔ اس نے کابینہ کے پہلے اجلاس میں جو یکم رمضان کو منعقد ہوا ترکی عوام کو رمضان المبارک کا یہ تحفہ پیش کر دیا کہ آج سے ترکی میں عربی زبان میں اذان ہوگی۔ لباس کی آزادی ہوگی، تعلیم قرآن کی آزادی ہوگی۔ ان کے لیے حج بیت اللہ کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ عدنان مندریس نے بعض مساجد کی تعمیر بھی شروع کرادی۔ ایا صوفیا کو تو وہ واگزار نہ کرا سکا۔ البتہ اس نے یہ اجازت دے دی کہ اس کی ڈیوڑھی میں نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ ترکی عوام کی خواہش کے مطابق ڈیموکریٹک پارٹی نے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات کا آغاز بھی کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے۔ اب ری پبلکن پارٹی کے اندر مزید تنزل آگیا۔ اور اس کے صرف ۲۴ نمائندے کامیاب ہوئے۔ عدنان مندریس کی حکومت نے اس مرتبہ ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے اس نے وہ تمام مساجد واپس لے لیں جو مصطفےٰ کمال پاشا کے عہد میں لوگوں کو فروخت کر دی گئی تھیں نیز عدنان مندریس نے ۲۰ مدارسِ ائمہ وخطباء کھولے۔ تین دینی تعلیم کے اعلیٰ ادارے قائم کیے، اور سینکڑوں حفظِ قرآن کے مکتب جاری کر دیے۔ عدنان مندریس اس قدر ذہین لیڈر تھا کہ جس علاقے کے اندر وہ محسوس کرتا کہ اس کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے تو وہ عوام کے دل جیتنے کے لیے وہاں کسی مسجد

کا افتتاح کر دیا۔ عصمت انونو نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن عدنان مندریس نے عرب دوستی کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے اسرائیلی مصنوعات کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ اور ۱۹۵۶ء میں اس نے اسرائیلی سفیر کو ترکی سے نکال دیا۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ ترکی کے اندر صنعت قائم کرنے کا بھی آغاز کیا۔ گو یہ آغاز غیر ملکی سرمایہ کے بل بوتے پر تھا۔

جمال گورسل کا فوجی انقلاب

ترکی فوج کے افسران نے محسوس کیا کہ اگر عدنان مندریس کی حکومت قائم رہی تو مصطفٰے کمال پاشا کے لادینی اصول بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور وہی اسلامی رُوح پھر عود کر آئے گی، جس سے انہوں نے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔ اس امر کا احساس نہ صرف فوجی افسران کو ہوا بلکہ مغربی طاقتوں نے بھی اس خطرے کو شدت سے بھانپ لیا۔ چنانچہ جمال گورسل کی قیادت میں ترکی فوج نے ۱۹۶۰ء میں انقلاب برپا کر دیا۔ عدنان مندریس اور ان کے ساتھیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان میں وزیر خارجہ فطین زورلو بھی تھے جو ترک عرب اتحاد کے سرگرم حامی تھے۔

۱۹۶۰ء کا سال اسلامی تحریک کے لیے نہایت اہم سال ہے۔ کیونکہ اسلامی تحریک کی تاریخ میں یہ ایک نئے اور اہم دَور کی کلید بن کر آیا۔ ترکی فوج جن عزائم اور منصوبوں کو لے کر آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ سب اُلٹ کر رکھ دیے۔ انقلابی حکمرانوں نے ایک طرف دُنیا کو یہ تصوّر دینا چاہا کہ وہ جمہوریت اور انسانی آزادی کے خلاف نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف انہوں نے عدنان مندریس کے دَور میں اُبھر آنے والے اسلامی اثرات اور سعید نورسی کی دعوت سے اُٹھنے والی کرنوں کو محو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی رُو سے انہوں نے نیا قانون جاری کیا جس میں نشر و اشاعت کی آزادی دی گئی جو اس سے پہلے بالکل مفقود تھی۔ اس آزادی سے اُن کے پیش نظر بائیں بازو کے عناصر کو یہ موقع فراہم کرنا تھا کہ وہ ملحدانہ اور گمراہ کُن لٹریچر کے ذریعے ملک کے اندر ایسی فکری تحریک برپا کریں جو اسلامی بیداری کی ہر علامت کا قلع قمع کر دے۔

چنانچہ بالفعل ایسا ہی ہوا۔ پریس کے یہ قوانین نافذ ہوتے ہی سرزمین ترکی کے اندر لینن، مارکس اور دوسرے ائمہ ضلالت کی کتابوں کی بارش ہونے لگی۔ ان کتابوں نے خاص طور پر طلباء کے اندر بائیں بازو کے نظریات کا طوفان برپا کر دیا۔ ۱۹۶۴ء تک یہ عناصر اس قدر طاقتور ہو گئے کہ قریب قریب ترکی کی یونیورسٹیاں اُن کی گرفت میں آگئیں۔ (باقی)